

تَفْہِیْمُ الْقُرْآنِ

(۴۰)

یوسف

(اثر رکوع ۶ تا رکوع ۱۰)

ایک روز بادشاہ نے کہا ”میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سوکھی۔ اے اہل دربار! مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو۔“ لوگوں نے کہا ”یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔“

اُن دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا، اُسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی اور اس نے کہا ”میں اچھے کو اس کی تاویل بتاتا ہوں مجھے ذرا (قید خانے میں یوسف کے پاس) بھیج دیجئے۔“ اُس نے جا کر کہا ”یوسف! اے سراپا راستی! مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں۔“ یہ سچ میں کئی سال کے زمانہ قید کا حال چھوڑ کر اب سر درشتہ بیان اس مقام سے جوڑا جاتا ہے جہاں سے حضرت یوسفؑ کو دنیوی مروج شروع ہوا۔

۱۔ بائبل اور تلمود کا بیان ہے کہ ان خوابوں سے بادشاہ بہت پریشان ہو گیا تھا اور اس نے اعلان عام کے ذریعہ اپنے ملک کے تمام دانشمندوں، کاہنوں اور سی پیشواؤں اور جاوید گروں کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا۔ ”میں قرآن نے یہاں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ بائبل اور تلمود سے معلوم ہوتا ہے (اور قیاس بھی کہتا ہے کہ ضرور ایسا ہوا ہوگا) کہ سردار ساقی نے یوسف علیہ السلام کے حالات بادشاہ سے بیان کیے، اور حیل میں اس کے خواب اور اسے سامنے کے خواب کی جیسی صحیح تعبیر انھوں نے دی تھی اس کا ذکر بھی کیا۔

۲۔ کہ تن میں لفظ ”صدیق“ استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں سچائی و راستبازی کے انتہائی مرتبے کے لیے استعمال (باقی صفحہ ۴۱ پر)

جن کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں بری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں ان لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ جان لیں۔ یوسف نے کہا "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے، اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصہ جو تمہاری خوراک کے کام آئے۔" نکالو اور باقی کو اس کی بالوں ہی میں رہنے دو، پھر سات برس بہت سخت ہوں گے جن میں وہ سب غلہ کھا جائے گا جو تم اُس زمانے کے لیے جمع کرو گے، اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں باران رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جگہ آئے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ۔

شاہی فرستادہ یوسف کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رکبے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قید خانے کے زمانہ قیام میں اس شخص نے یوسف علیہ السلام کی سیرت پاک سے کیسا گہرا اثر لیا تھا اور یہ اثر ایک مدت اور گزر جانے کے بعد بھی کتنا راسخ تھا۔

(حواشی صفحہ ہذا) لے یعنی آپ کی قدر و منزلت جان لیں اور ان کو احساس ہو کہ کس پایہ کے آدمی کو انہوں نے بند کر رکھا ہے اور اس طرح مجھے اپنے اُس وعدے کے ایفاء کا موقع مل جائے جو میں نے آپ کے قید کے زمانہ میں کیا تھا۔

لے متن میں لفظ "عصرون" استعمال ہوا ہے جس کے لفظی معنی "نچوڑنے" کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہاں سرسبزی و شاوہابی کی وہ کیفیت بیان کرنا ہے جو قحط کے بعد باران رحمت اور دریائے نیل کے چڑھاؤ سے رونما ہونے والی تھی۔ جب زمین سیراب ہوتی ہے تو نیل دینے والے نیچ اور رس دینے والے پھل اور میوے خوب پیدا ہوتے ہیں، اور مویشی بھی چارہ اچھا بننے کی وجہ سے خوب دودھ دینے لگتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے اس تعبیر میں صرف بادشاہ کے خواب کا مطلب بتانے ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ خوشحالی کے ابتدائی سات برسوں میں آنے والے قحط کے لیے کیا پیش بندی کی جائے اور غلہ کو محفوظ رکھنے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ پھر مزید براں اپنے قحط کے بعد اچھے دن آنے کی خوشخبری بھی دیدی جس کا ذکر بادشاہ کے خواب میں نہ تھا۔

لے یہاں سے لے کر بادشاہ کی ملاقات تک جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے — جو اس قصے کا ایک بڑا ہی اہم (باقی صفحہ ۱۴ پر)

عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی سکاری سے واقف ہی ہے۔“
 (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) باب ہے۔ اس کو کوئی ذکر بائبل اور تلمود میں نہیں ہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر یوسفؑ
 فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے، حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی زیادہ گھٹیا صورت میں
 حضرت یوسفؑ کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسفؑ کو میرے حضور پیش کرو،
 اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسفؑ
 کو قید خانے سے نکالا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لاکر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا، وہاں
 زرد جواہر کی چمک دمک اور دربار کی شان دیکھ کر یوسفؑ ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی
 سات سیڑھیاں تھیں، قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور
 بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا۔ اور جب ادنیٰ طبقہ کا کوئی آدمی شاہی محلہ کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری
 سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسفؑ اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دیا۔
 اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی: اس تصویر میں بنی اسرائیل نے اپنے جلیل القدر پیغمبر کو جتنا گرا کر
 پیش کیا ہے اس کو نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن ان کے قید سے نکلنے اور بادشاہ سے ملنے کا واقعہ کس شان اور کس
 آن بان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا ہر صاحب نظر کا اپنا کام ہے کہ ان دونوں تصویروں میں سے کونسی تصویر
 پیغمبری کے مرتبے سے زیادہ مناسب رکھتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بات بھی عقل عام کو کھٹکتی ہے کہ اگر بادشاہ کی ملاقات کے وقت
 تک حضرت یوسفؑ کی حیثیت مصر میں اتنی ہی گری ہوئی تھی جتنی تلمود کے بیان سے معلوم ہوتی ہے تو خواب کی تعبیر سننے ہی
 بیکار، ان کو تمام سلطنت کا مختار کل کیسے بنا دیا گیا۔ ایک مہذب و تمدن ملک میں اتنا بڑا مرتبہ تو آدمی کو اسی وقت ملا کرتا
 ہے جب کہ وہ اپنی اخلاقی و ذہنی برتری کا سکہ لوگوں پر بٹھا چکا ہو۔ پس عقل کی رو سے بھی بائبل اور تلمود کی نسبت قرآن
 ہی کا بیان زیادہ مطابق حقیقت معلوم ہوتا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۴) لے یعنی جان تک میرے رب کا معاملہ ہے، اس کو تو پہلے ہی میری بیگناہی کا حال معلوم ہے، مگر تمہارے
 رب کو بھی میری رہائی سے پہلے اس معاملہ کی پوری طرح تحقیق کر لینی چاہیے جس کی بنا پر مجھے جیل میں ڈالا گیا تھا، کیونکہ میں
 کسی شبہ اور کسی بدگمانی کا داغ لیے ہوئے خلق کے سامنے نہیں آنا چاہتا، مجھے رہا کرنا ہے تو پہلے برسر عام یہ ثابت ہونا چاہیے کہ
 (باقی صفحہ ۱۴ پر)

بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تھارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسف کو بھانے کی کوشش کی تھی؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا "عاشا اللہ ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔" عزیز کی بیوی بول اٹھی "اب حق کھل چکا ہے، وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی، بے شک بالکل سچا ہے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) میں بے قصور تھا، اصل قصور وار تمھاری سلطنت کے کارفرما اور کارپرداز تھے جنہوں نے اپنی بیگمات کی بد اطواری کا خمیازہ میری پاک دامنی پہ ڈالا۔ اس مطالبے کو حضرت یوسف جن الفاظ میں پیش کرتے ہیں ان سے عاتق ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس پورے واقعہ سے پہلے ہی واقف تھا جو نگیم عزیز کی دعوت کے موقع پر پیش آیا تھا، بلکہ وہ ایسا مشہور واقعہ تھا کہ اس کی طرف صرف ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ پھر اس مطالبہ میں حضرت یوسف عزیز مصر کی بیوی کو چھوڑ کر صرف ہاتھ کاٹنے والی عورتوں کے ذکر پر اکتفا فرماتے ہیں۔ یہ ان کی انتہائی شرافت نفس کا ایک اور ثبوت ہے۔ اس عورت نے ان کے ساتھ خواہ کتنی ہی برائی کی ہو، مگر پھر بھی اس کا شوہر ان کا محسن تھا اس لیے انھوں نے نہ چاہا کہ اس کے ناموس پر خود کوئی حرج لائیں۔

(حواشی صفحہ ۱۷) ممکن ہے کہ شاہی محل میں ان تمام خواتین کو جمع کر کے یہ شہادت لی گئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ نے کسی معتد خاص کو بھیج کر فردا فردا ان سے دریافت کرایا ہو۔

۱۷۱ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان شہادتوں نے کس طرح آٹھ نو سال پہلے کے واقعات کو تازہ کر دیا ہوگا، کس طرح حضرت یوسف کی شخصیت زمانہ قید کی طویل گمنامی سے نکل کر یکساں سطح پر آگئی ہوگی، اور کس طرح مصر کے تمام اشراف معززین، متوسطین اور عوام تک میں آپ کا اخلاقی وقار قائم ہو گیا ہوگا۔ اوپر بائبل اور تلمود کے حوالے سے یہ بات گزر چکی ہے کہ بادشاہ نے اعلان عام کر کے تمام مملکت کے دانشمندیوں اور علماء اور پیروں کو جمع کیا تھا اور وہ سب اس کے خوب کامطلب بیان کرنے سے عاجز ہو چکے تھے، اور حضرت یوسف نے اس کا مطلب بتا دیا۔ اس بنا پر پہلے ہی ت سارے ملک کی نگاہیں آپ کی ذات پر مرکوز ہو چکی ہوں گی۔ پھر جب بادشاہ کی طلبی پر اپنے قید خانے سے انکار کیا ہوگا تو سائے لڑک اچنبھے میں پڑ گئے ہوں گے کہ یہ عجیب قسم کا بلند حوصلہ انسان ہے جس کو آٹھ نو برس کی قید کے بعد بادشاہ وقت صبر بان ہو کر بلارہا ہے اور پھر بھی وہ بے تاب ہو کر باہر نہیں نکلتا۔ پھر جب لڑگوں کو معلوم ہوا ہوگا کہ یوسف نے اپنی رہائی قبول کرنے اور بادشاہ وقت کی ملاقات کو آنے کیلئے کیا شرط پیش کی ہے تو سب کی نگاہیں اس تحقیقات کے (باقی صفحہ ۱۷ پر)

(یوسف نے کہا) اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے درپردہ اس کی خیانت
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹) نتیجے پر لگ گئی ہوں گی۔ اور جب لوگوں نے اس کا نتیجہ سنا ہو گا تو ملک کا بیچ بچ عیش عیش کرتا رہ گیا ہو گا کہ
کس قدر پاکیزہ سیرت کا ہے یہ انسان جس کی طہارت نفس پر آج وہی لوگ گواہی دے رہے ہیں جنہوں نے مل جل کر اس سے
جیل میں ڈالا تھا۔ اس صورت حال پر اگر غور کیا جائے تو اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے کہ اُس وقت حضرت یوسف کے
ہام عروج پر پہنچنے کے لیے فضا پوری طرح سازگار ہو چکی تھی، اور اس کے بعد یہ بات کچھ بھی قابل تعجب نہیں رہتی کہ
حضرت یوسف نے بادشاہ سے ملاقات کے موقع پر خزانہ ارض کی سپردگی کا مطالبہ کیسے بے دھڑک پیش کر دیا اور
بادشاہ نے اسے کیوں بے تامل قبول کر لیا۔ اگر بات صرت اسی قدر ہوتی کہ جیل کے ایک قیدی نے بادشاہ کے ایک
خواب کی تعبیر بتادی تھی تو ظاہر ہے کہ اس پر وہ زیادہ سے زیادہ کسی انعام کا اور خلاصی پا جانے کا سہتی ہو سکتا تھا۔
اتنی سی بات اس کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ بادشاہ سے کہے "خزانہ ارض میرے حوالہ کرو" اور بادشاہ کہے
"لیجیے، سب کچھ حاضر ہے۔"

(حاشیہ صفحہ ۲۰) لے یہ بات غالباً حضرت یوسف نے اس وقت کہی ہو گی جب قید خانہ میں آپ کو تحقیقات کے نتیجے
کی خبر دی گئی ہو گی۔ بعض مفسرین جن میں ابن تیمیہ اور ابن کثیر بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسف
کا نہیں بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ امراة العزیز کے قول سے
متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ "اِنَّهُ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ" پر امراة العزیز
کی بات ختم ہو گئی اور بعد کا کلام حضرت یوسف کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے
سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی سراست نہ ہو کہ یہ قول فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی
قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جاسکے، اور یہاں ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے اس لیے
یہی ماننا پڑے گا کہ اللّٰہُ حَنَّصٌ لّٰحِظٌ سے لے کر اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ تک، پورا کلام امراة العزیز کا ہے۔ لیکن
مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت
بڑا قرینہ ہے جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلاشبہ امراة العزیز کے منہ پر چھتا ہے، مگر
کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شان کلام سات کہہ رہی ہے کہ اس کے قابل
(باقی صفحہ ۲۰ پر)

نہیں کی تھی، اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں اُن کی چالوں کو اسد کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الایہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میزرب بڑا غفور و رحیم ہے۔“

بادشاہ نے کہا: ”انہیں میرے پاس لاؤ کہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں۔“

جب یوسف نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا: ”اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے۔“ یوسف نے کہا: ”مک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) حضرت یوسف ہیں نہ کہ عزیز مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خدا ترسی بول رہی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اُس زبان سے نکلا ہوا نہیں ہو سکتا جس سے ہیتِ لدیہ نکلتا تھا، جس سے ما جزاء من اساءد باہلک سوءاً نکلتا تھا، اور جس سے بھری فضل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ لئن لم یفعل ما امرت لیسجنن، بلکہ ایسا پاکیزہ فقرہ وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے معاذ اللہ انتہ ربی احسن مثوای کہہ چکی تھی، جو رب السجن احب الی مساید عونی الیہ کہہ چکی تھی، جو اکا تصرف عنی کیدھن اصب الیہن کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسف صدیق کے بجائے امراۃ العزیز کا کلام ماننا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ اور ایمان اور اصلاح نفس کی توفیق نصیب ہو گئی تھی، اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۱۸) اس سے پہلے جو توضیحات گزر چکی ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ کوئی ذکر کی درخواست نہیں تھی جو کسی طالبِ جاہ نے وقت کے بادشاہ کو اپنے اوپر مہربان دیکھ کر محبت سے پیش کر دی ہو، بلکہ وہ یہ اُس انقلاب کا دروازہ کھولنے کے لیے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسف کی اخلاقی طاقت سے پچھلے دس بارہ سال کے اندر نشوونما پا کر ظہور کے لیے تیار ہو چکا تھا اور اب جس کا فتح باب صرف ایک ٹھونکے ہی کا محتاج تھا۔ حضرت یوسفؑ آزمائشوں کے ایک طویل سلسلے گزر کر آ رہے تھے اور یہ آزمائشیں کسی گنہگار کے گوتے میں پیش نہیں آئی تھیں بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شہریوں تک مصر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ان آزمائشوں میں انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت (باقی صفحہ ۱۹ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸) راستبازی، علم، ضبط نفس، مالی ظرفی، ذہانت و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانہ کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں، دل ان سے سخر ہو چکے تھے، اور خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیرا ڈال چکا تھا۔ اُن کا "حفیظ" اور "علیم" ہونا اب محض ایک دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ واقعہ تھا جس پر سب ایمان لائے ہوئے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف خود حکومت کے اُن اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے آمادگی ظاہر کریں جن کے لیے بادشاہ اور اس کے اعیان سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ سمجھنے والے آدمی اللہ کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وہ کسر تھی جو انہوں نے اپنے ۲۱ فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبے کے نکلنے ہی بادشاہ اور اس کی کونسل نے جس طرح اسے بسر و حکم قبول کیا وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لیے ایک اشارے ہی کا منتظر تھا۔ (تلمود کا بیان ہے کہ حضرت یوسف کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہا بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پورے شاہی کونسل نے بالاتفاق اس کے حق میں رائے دی تھی)۔

یہ اختیارات جو حضرت یوسف نے مانگے اور ان کو سونپے گئے ان کی نوعیت کیا تھی؟ ناواقف لوگ یہاں ترازین ارض کے الفاظ اور آگے چل کر غلہ کی تقسیم کا ذکر دیکھ کر قیاس کرتے ہیں کہ شاید یہ افسر خزانہ یا افسر مال یا قضا کشنر یا دزیروایات یا دزیروزانیات کی قسم کا کوئی عہدہ ہوگا۔ لیکن قرآن، توراۃ اور تلمود کی متفقہ شہادت ہے کہ درحقیقت حضرت یوسف سلطنت مصر کے مختار کل (رومی اصطلاح میں ڈکٹٹر) بنائے گئے تھے اور ملک کا سیاہ و سپید سب کچھ ان کے اختیار میں دیدیا گیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ جب حضرت یعقوب مصر پہنچے ہیں تو اس وقت حضرت یوسف تخت نشین تھے (ورفع ابویہ علی العرش)۔ خود حضرت یوسف کی زبان سے یہ دعا قرآن میں منقول ہے کہ اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہی عطا کی (رب قد ایتنی من المملک)۔ اور اللہ تعالیٰ مصر پر ان کے اقتدار کی کیفیت یہ بیان فرماتا ہے کہ ساری سرزمین مصر ان کا تھی (یتبوا منها حیث یشاء)۔ یہی توراۃ تو وہ شہادت دیتی ہے کہ فرعون نے یوسف کو کہا:

و تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی فقط تخت کا مالک ہونے

کے سبب میں بزرگ تر ہوں گا..... دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بنانا ہوں.....

اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ ڈالنے پائے گا۔ اور فرعون

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

(نقصیہ صفحہ ۱۹) نے یوسف کا نام صفات فنیخ (دنیا کی نجات دہندہ) رکھا۔ (پیدائش: ۲۱: ۲۵-۲۹)

اور تلمود کہتی ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے مصر سے واپس جا کر اپنے باپ سے عالم مصر یوسف کی تعریف کرتے

ہوئے بین کیا:

”اپنے ملک کے باشندوں پر اس کا اقتدار سب سے بالا ہے۔ اس کے حکم پر وہ نچتے اور اسی کے حکم

پر وہ داخل ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سے ملے ملک پر فرمانروائی کرتی ہے۔ کسی معاملہ میں فرعون کے

اذن کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت یوسف نے یہ اختیارات کس غرض کے لیے مانگے تھے؟ کیا انھوں نے اپنی خدمات اس لیے

پیش کی تھیں کہ ایک کافر حکومت کے نظام کو اس کے کافرانہ اصول و قوانین ہی پر چلائیں؟ یا ان کے پیش نظر یہ تھا کہ حکومت

کا اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملک کے نظام تمدن و اخلاق و سیاست کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں؟ اس سوال کا

بہترین جواب وہ ہے جو علامہ زرخشیری نے اپنی تفسیر ”کائنات“ میں دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حضرت یوسف نے اجماعی علی خزانہ الامراض جو فرمایا تو اس سے ان کی غرض مرنے

یہ تھی کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام جاری کرنے اور حق قائم کرنے اور بدل پھیلانے کا موقع مل جائے

اور وہ اس کام کو انجام دینے کی طاقت حاصل کر لیں جس کے لیے انبیاء بھیجے جاتے ہیں۔ انھوں نے

بادشاہی کی خبیثت اور دنیا کے لالچ میں یہ مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ جانتے ہوئے کیا تھا کہ کوئی

دوسرا شخص ان کے سوا ایسا نہیں ہے جو اس کام کو انجام دے سکے۔“

اور پھر یہ ہے کہ یہ سوال دراصل ایک اور سوال پیدا کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ اہم اور بنیادی سوال ہے۔

وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف آیا پیغمبر بھی تھے یا نہیں؟ اگر پیغمبر تھے تو کیا قرآن میں ہم کو پیغمبری کا یہی تصور ملتا ہے کہ اسلام کا وہی

خود نظام کفر کو کافرانہ اصولوں پر چلانے کے لیے اپنی خدمات پیش کرے؟ بلکہ یہ سوال اس پر بھی ختم نہیں ہوتا، اس سے بھی

زیادہ نازک اور سخت ایک دوسرے سوال پر جا کر ٹھیرتا ہے، یعنی یہ کہ حضرت یوسف ایک راستباز آدمی بھی تھے یا نہیں؟

اگر راستباز تھے تو کیا ایک راستباز انسان کا یہی کام ہے کہ قید خانے میں تو وہ اپنی پیغمبرانہ دعوت کا آغاز اس سوال سے

کرے کہ ”بت سے رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اور بار بار اہل مصر پر بھی واضح کر دے کہ تمہارے

(بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی، وہ نجات تھا کہ اس میں جانا چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) ان بہت سے متعوق خود ساختہ خداؤں میں سے ایک خدا شاہ سرچی ہے، اور صاف صاف اپنے مشن کا بنیادی عقیدہ یہ بیان کرے کہ "فرزروائی کے اختیارات خدائے واحد کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں"، مگر جب عمل آزمائش کا وقت آئے تو وہی شخص خود اس نظام حکومت کا خادم، بلکہ ناظم اور محافظ اور پشت پناہ تک بن جائے جو شاہ مصر کی رویت میں چل رہا تھا اور جس کا بنیادی نظریہ فرزانروائی کے اختیارات خدا کے لیے نہیں بلکہ بادشاہ کے لیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقام کی تفسیر میں دو اختلاط کے مسلمانوں نے کچھ اسی ذہنیت کا اظہار کیا ہے جو کبھی یسویوں کی خصوصیت تھی۔ یہ یہودیوں کا حال تھا کہ جب وہ ذہنی و اخلاقی پستی میں مبتلا ہوئے تو پچھلی تاریخ میں جن جن بزرگوں کی سیرتیں ان کو بندی پر چڑھنے کا سبق دیتی تھیں ان سب کو وہ نیچے گرا کر اپنے مرتبے پر تار لاسے تاکہ اپنے لیے اور زیادہ نیچے گرنے کا بہانہ پیدا کریں۔ انوس کریمی کچھ اب سلمات بھی کر رہے ہیں۔ انھیں کہ فر حکومتوں کی چاکری کرنی ہے۔ مگر اس پستی میں گرتے ہوئے اسلام اور اس کے علمبرداروں کی بندی دیکھ کر انھیں شرم آتی ہے۔ لہذا اس شرم کو مٹانے اور اپنے ضمیر کو راضی کرنے کے لیے یہ اپنے ساتھ اس مجلس القدر پنمبر کو بھی خدمت کفر کی گہرائی میں لے گئے، چاہتے ہیں جس کی زندگی و در اسل انھیں یہ سبق دے رہی تھی کہ اگر کسی ملک میں ایک اور صرحت ایک مہمومین بھی خالص اسلامی اخلاق اور ایمانی فراست و حکمت کا حامل ہو تو وہ تنہا مجتہد اپنے اخلاق اور اپنی حکمت کے زور سے اسلامی انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ کہ رومن کی اخلاقی طاقت (بشرطیکہ وہ اس کا استعمال جانتا ہو اور اسے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہو) فوج اور اسلحہ اور سرور سامان کے بغیر بھی ملک فتح کر سکتی ہے اور سلطنتوں کو مسخر کر سکتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ۲۱) لہذا یعنی اب ساری سرزمین مصر اس کی تھی، اس کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کر سکتا تھا، وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ رہا تھا جو اس سے، وہ نہ جانتا ہو، نہ گویا اس کا دل تسلط اور ہم گیر اقتدار کا سیوا نہ ہے جو حضرت یوسف کو اس ملک پر حاصل تھا۔ قدیم مفسرین بھی اس آیت کی یہی تفسیر کرتے ہیں، چنانچہ ابن زید کے حوالے سے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ "ہم نے یوسف کو ان سب چیزوں کا، ملک بنا دیا جو مصر میں تھیں۔" دنیا کے اس حصہ میں وہ جہاں جو کچھ پاتا، کر سکتا تھا، وہ سرزمین اس کے حوالہ کردی گئی تھی، حتیٰ کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو

مارا نہیں جاتا، اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔
یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا
مگر وہ اس سے نا آشنا تھے۔ جب اس نے ان کا سامان لے لیا تو کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) اپنا زیر دست کر لے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا۔" دوسرا قول علامہ موصوفیؒ
بجاہد کا نقل کیا ہے جو مشہور ائمہ تفسیر میں سے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بادشاہ مہر یوسف کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

(حاشیہ صفحہ ۲۱) یہ تنبیہ ہے اس امر پر کہ کوئی شخص دنیوی حکومت و اقتدار کو نیکی و نیکو کاری کا اصلی اجر اور حقیقی اجر مطلوب نہ سمجھ
بیٹھے بلکہ خبردار رہے کہ بہترین اجر اور وہ اجر جو مومن کو مطلوب ہونا چاہیے وہ ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔

۳۵ یہاں پھر سات آٹھ برس کے واقعات درمیان میں چھوڑ کر سلسلہ بیان اس جگہ سے جوڑ دیا گیا ہے جہاں سے
بنی اسرائیل کے مصر منتقل ہونے اور حضرت یعقوب کو اپنے گم شدہ عاصی زادے کا پتہ ملنے کی ابتدا ہوتی ہے۔ بیچ میں واقعات
چھوڑ دیے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خواب والی پیش خبری کے مطابق حضرت یوسف کی حکومت پہلے سات سال مصر میں اتنا
خوشحالی کے گزرے اور ان ایام میں انہوں نے آنے والے قحط کے لیے وہ تمام پیش بندیاں کر لیں جن کا مشورہ بادشاہ کے
خواب کی تعبیر بتاتے وقت وہ دے چکے تھے۔ اس کے بعد قحط کا دور شروع ہوا اور یہ قحط صرف مصر ہی میں نہ تھا بلکہ اس
کے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شام، فلسطین، شرق اردن، شامی عرب، سب جگہ خشک سالی کا دور دورہ تھا۔
ان حالات میں حضرت یوسف کے دانشمندانہ انتظام کی بدولت صرف مصر ہی وہ ملک تھا جہاں قحط کے باوجود غلہ کی افراط
تھی۔ اس لیے تمام ہمسایہ ممالک کے لوگ مجبور ہوئے کہ غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر کی طرف رجوع کریں۔ یہی وہ موقع تھا جب فلسطین
سے حضرت یوسف کے بھائی غلہ خریدنے کے لیے مصر پہنچے۔ غالباً حضرت یوسف نے غلہ کی اس طرح ضابطہ بندی کی ہوگی کہ ہر دور
ممالک میں خاص اجازت ناموں کے بغیر اور خاص مقدار سے زیادہ غلہ نہ جاسکتا ہوگا۔ اس وجہ سے جب برادران یوسف
غیر ملک سے آکر غلہ حاصل کرنا چاہا ہوگا تو انہیں اس کے لیے خاص اجازت نامہ طلب کرنے کی ضرورت پیش آئی ہوگی
اور اس طرح حضرت یوسف کے سامنے ان کی پیشی کی نوبت آئی ہوگی۔

۳۶ برادران یوسف کا آپ کو نہ پہچانا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔ جس وقت انہوں نے آپ کو کنوئیں میں
تھا اس وقت آپ صرف سترہ سال کے لڑکے تھے، اور اب آپ کی عمر ۳۳ سال کے لگ بھگ تھی۔ اتنی طویل مدت
(باقی صفحہ ۲۲ پر)

لانا، دیکھتے نہیں ہر کہ میں کس طرح پیانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں، اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ انھوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجے پر راضی ہو جائیں، اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔" یوسف نے اپنے غلاموں کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲) آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ پھر یہ تو ان کے سان دگان میں بھی نہ تھا کہ میں بھائی کو وہ کنوئیں میں پھینک گئے تھے وہ آج مصر کا غنم مطلق ہو گا۔

(حاشیہ صفحہ ۲۳) ۱۵۔ تنصاریاں کی وجہ سے شاید کسی کو یہ سمجھتے ہیں وقت ہو کہ حضرت یوسف جب اپنی شخصیت کو ان پر ظاہر کرنا چاہتے تھے تو پھر ان کے سوتیلے بھائی کا ذکر کیسے لگایا اور اس کو لانے پر اس قدر اصرار کرنے کے کیا معنی تھے، کیونکہ اس طرح تو راز فاش ہو جاتا تھا۔ لیکن عقوڑا سا غور کرنے سے بات صاف سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہاں غلے کی ضابطہ بندی تھی اور ہر شخص ایک مقررہ مقدار غلہ ہی لے سکتا تھا۔ غلہ لینے کے لیے یہ دشت بھائی آئے تھے، مگر وہ اپنے والد اور اپنے گیارہ بھائی کا حصہ بھی مانگتے ہوں گے۔ اس پر حضرت یوسف نے کہا ہو گا کہ تمہارے والد کے خود نہ آنے کے لیے تو یہ عذر معقول ہو سکتا ہے کہ وہ بہت بوڑھے اور نابینا ہیں مگر بھائی کے نہ آنے کا کیا معقول سبب ہو سکتا ہے؟ کہیں تم ایک فرضی نام سے زائد غلہ حاصل کرنے اور پھر ناجائز تجارت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں اپنے گھر کے کچھ حالات بیان کیے ہوں گے اور بتایا ہو گا کہ وہ ہمارا سوتیلہ بھائی ہے اور بعض وجوہ سے ہمارے والد اس کو ہمارے ساتھ بھیجنے میں تامل کرتے ہیں۔ تب حضرت یوسف نے فرمایا ہو گا کہ خیر، اس وقت تو ہم تمہاری زبان کا اعتبار کر کے تم کو پرانہ غلہ دیے دیتے ہیں مگر آئندہ اگر تم اس کو ساتھ نہ لاؤ گے تو تمہارا اعتبار جاتا رہے گا اور تمہیں یہاں سے کوئی غلہ نہ مل سکے گا۔ اس حاکم ذہنی کے ساتھ آپ نے ان کو اپنے اسان اور اپنی مہمان نوازی سے بھی رام کرنے کی کوشش کی، کیونکہ دل اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ یہ معاملہ کی ایک سادہ سی صورت ہے جو ذرا غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے اور اس صورت میں بائبل کی اس مبالغہ آمیز داستان پر اعتماد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی جو کتاب پیدائش کے باب ۲۴-۳۴ میں بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔

اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جہاں دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو اس امید پر کہ گھریلو خرچہ پانچ چھ ماہیں گے اور عجب نہیں کہ پھر نہیں۔

جب وہ اپنے باپ کے پاس واپس گئے تو کہا: "ابا جان، آئندہ ہم کو غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے، لہذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تاکہ ہم غلہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔" باپ نے جواب دیا: "کیا میں اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسہ کروں جیسا اس کے پہلے اس کے بھائی کے معاملہ میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے زیادہ کریم فرمانے والا ہے۔" پھر جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انھیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے: "ابا جان! اور نہیں کیا چاہتے، دیکھئے یہ جہاں مال بھی ہمیں واپس دیدیا گیا ہے۔ میں ہم اب جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے۔ اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بار شتر اور زیادہ بھالے آئیں گے، اتنے غلہ کا احاطہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔ ان کے باپ نے کہا: "میں اس کو ہرگز نکھارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام سے تم کو پیمانہ نہ دیدو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے انہی کہیں تم گھیر ہی لے جاؤ۔" جب انھوں نے اس کو اپنے پیمانہ دیدیے تو اس نے کہا: "دیکھو، ہمارے اس تول پر اللہ نگبان ہے۔" پھر اس نے کہا: "میرے بچو! مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے کے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا، مگر احد کی حیثیت سے تم کو بھالنا میرے بس ہے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف کے بعد پھر ایک بیٹے کو بھیجتے وقت حضرت یعقوب کے دل پر کیا کچھ گزری ہوگی۔ کو خدا پر بھروسہ تھا اور سرورِ تسلیم میں ان کا مقام نہایت بلند تھا۔ مگر پھر بھی سچے تو انسان ہی۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں آتے ہوں گے اور وہ راہِ اس خیال سے کانپ اٹھتے ہوں گے کہ خدا جانے اب اس لڑکے کی صورت بھی دیکھ سکوں گی یا نہیں۔ اسی لیے وہ چاہتے ہوں گے کہ اپنی نہنگ احتیاط میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

یہ احتیاطی مشورہ کہ مصر کے دارالسلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازے سے نہ جائیں، ان سیاسی حالات کا تصور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ سلطنتِ مصر کی سرحد پر آزاد تجارتی علاقے کے رہنے والے تھے۔ اہل مصر اس علاقے کے لوگوں کو اسی شہرہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس نگاہ سے

(۱ فی صفحہ ۲۵ پر)

میں نہیں ہے۔ فرما تو انی کے اختیارات اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں متفرق دروازوں سے داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مطابق کچھ بھی کام نہ آ سکی، ہاں بس یعقوب کے دل میں جو شک تھی اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کرنی مگر وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحب علم تھا مگر اکثر لوگ حاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں؟

۴۵

(تیسرے حاشیہ صفحہ ۲۴) آج ہندوستان کی حکومت آزاد سرحدی علاقے والوں کو دیکھتی ہے۔ حضرت یعقوب کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ اس قطعے کے زمانہ میں اگر یہ لوگ ایک جتھے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انہیں شہتہ بھجا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۲۴) نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر اور توکل کے درمیان یہ ٹھیک ٹھیک توازن جو تم حضرت یعقوب کے تذکرہ بالا اقوال میں پاتے ہو، یہ دراصل علم حقیقت کے اس فیضان کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوا تھا۔ ایک طرف وہ عالم اسباب کے قوانین کے مطابق تمام ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل و فکر اور تجربہ کی بنا پر اختیار کرنی ممکن تھیں۔ بیٹوں کو ان کا پہلا جرم یاد دلا کر زبردستیہ کرتے ہیں تاکہ وہ دوبارہ ویسا ہی جرم کرنے کی عادت نہ کریں۔ ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے، اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جس احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے بھی استعمال کرنے پر حکم و سبقت ہیں تاکہ اپنی حد تک کوئی خارجی سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے جو ان لوگوں کے گھر جانے کا موجب ہو۔ مگر وہی طرف ہرگز ان کے پیش نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسان فی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی، اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے۔ اور بھروسہ اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر کرنا چاہیے۔ یہ صحیح توازن اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں صرف وہی شخص قائم کر سکتا ہے جو حقیقت کا علم رکھتا ہو۔ جو بھی جانتا ہو کہ حیات دنیا کے ظاہری پہلو میں اللہ کی بنائی ہوئی فطرت انسان سے کس سی عمل کا تقاضا کرتی ہے، اور اس سے بھی واقف ہو کہ اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت نفس الامری پوشیدہ ہے اس کی

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

یہ لوگ یوسف کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلایا اور اسے بتا دیا کہ میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھویا گیا تھا)۔ اب ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔

جب یوسف ان بھائیوں کا سامان لے دوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیار رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا "اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو۔" انھوں نے پٹ کر پوچھا "تمہاری کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵) بنا پر اصل کار فرما طاقت کونسی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی سی و عمل پر اتان کا بھروسہ کس بے بین ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر ظاہر کا غلبہ ہوتا ہے وہ توکل سے غافل ہو کر توکل

کی کوسب کچھ سمجھتا ہے، اور جس کے دل پر باطن چھا جاتا ہے وہ تدبیر کے پروہ ہو کر ترے توکل کی بل پر زندگی کی گاڑی چلانا چاہتا ہے۔ (حواشی صفحہ ۲۵) لہ اس فقرے میں وہ ساری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو اکیس بائیس برس کے بعد دونوں ماں جانے بھائیوں

کے ملنے پر پیش آئی ہوگی۔ حضرت یوسف نے بتایا ہوگا کہ وہ کن حالات گزرتے ہوئے اس مہینے پر پہنچے۔ بن یسین نے بتایا ہوگا کہ ان کے چچے سوتیلے بھائیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا بدسلوکیاں کیں۔ پھر حضرت یوسف نے بھائی کو تسلی دی ہوگی کہ

اب تم میرے پاس ہی رہو گے، ان ظالموں کے پنجے میں تم کو دوبارہ نہیں جانے دوں گا۔ بعد نہیں کہ اس موقع پر دونوں بھائیوں میں یہ بھی طے ہو گیا ہو کہ بن یسین کو مصر میں روک رکھنے کے لیے کیا تدبیر کی جائے جس سے وہ پردہ بھی ہٹا رہے

ہو حضرت یوسف علیہ السلام بھی ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

لہ پالہ رکھنے کا فن غالباً حضرت یوسف نے اپنے بھائی کی رضا مندی سے اور اس کے علم میں کیا تھا جیسا کہ اس پہلے والی آیت اشارہ کر رہی ہے۔ حضرت یوسف کو بائیس برس کے بچے کے بھائی کی جدائی گوارا نہ ہوگی، بھائی خود

بھی ان ظالموں کے ساتھ واپس جانا نہ چاہتا ہوگا، مگر علانیہ آپ کا اسے روکنا اور اس کا رکب جانا بنی اس کے ممکن نہ تھا کہ حضرت یوسف اپنی شخصیت کو ظاہر کریں، اور اس کا اظہار اس موقع پر صحت کے خلاف تھا، اس لیے دونوں بھائیوں میں شور مچا

ہوگا کہ اسے رکھنے کی یہ تدبیر کی جائے۔ اگرچہ تھوڑی دیر کے لیے اس میں بھائی کی کسکی تھی، مگر اس پر چوری کا دھبہ لگتا تھا، لیکن بعد میں یہ وجہ اس طرح باسانی و حل مل سکتا تھا کہ دونوں بھائی اصل معاملہ کو دنیا پر ظاہر کر دیں۔

لہ اس آیت میں، اور بعد والی آیات میں بھی کہیں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکے کہ حضرت یوسف نے اپنے ملازموں کو اس راز میں شریک کیا تھا اور انھیں خود یہ سکھایا تھا کہ قافلے والوں

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

چیز کھوئی گئی؟ سرکاری ملازموں نے کہا بادشاہ کا پیادہ ہم کو نہیں ملتا (اور ان کے بعد اس نے کہا) جو شخص لا کر دے گا اس کے لیے ایک بار شترانعام ہے۔ اس کام میں ذمہ لیتا ہوں۔ ان بھائیوں نے کہا خدا کی قسم تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا، اگر تمہاری بات جھوٹ نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا اُس کی سزا جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے ہاں تو ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔ تب یوسف نے اپنے بھائی سے پہلے اُن کی خیریتوں کی تلاشی یعنی شروع کی پھر اپنے بھائی کی خیریت سے گم شدہ چیز برآمد کرنی۔ اس طرح ہم نے یوسف کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اُس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی شاہ مصر کے قانون) میں اپنے بھائی کو کپڑا الا یہ کہ اندر ہی ایسا چاہتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) جھوٹا الزام لگاؤ۔ واقعہ کی سادہ صورت جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیادہ پوشی کے ساتھ رکھ دیا گیا ہوگا بعد میں جب سرکاری ملازموں نے اسے نہ پایا ہوگا تو قیاس کیا ہوگا کہ ہونہ ہو، یہ کام انہی قافلے والوں میں کسی کا ہو جو یہاں ٹھہرے ہوئے حواری (صفحہ ۲۷) شدہ خیال رہے کہ یہ بھائی خاندان ابراہیمی کے افراد تھے، لہذا انہوں نے چوری کے معاملہ میں جو قانون بیان کیا وہ شریعت ابراہیمی کا قانون تھا۔

تلا یہ کوئی تدبیر ہے جو حضرت یوسف کی تائید میں براہ راست خدا کی طرف سے کی گئی؟ ظاہر ہے کہ پیادہ رکھنے کی تدبیر جو حضرت یوسف نے خود کی تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ سرکاری ملازموں نے چوری کا شبہ کر کے قافلے والوں کو جو روکا، غور بھی حسب معمول یہ کام تھا جو ایسے مواقع پر سب سرکاری ملازم کیا کرتے ہیں۔ پھر وہ کوئی تدبیر ہے جو اس سلسلہ واقعات میں براہ راست خداوند عالم کی طرف سے عمل میں لائی گئی؟ اوپر کی آیات میں تلاش کرنے سے اس کے سوا کسی دوسری چیز کو تدبیر خداوندی کا مصداق نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ سرکاری ملازموں نے خلاف معمول خود مشتبہ ملازموں سے چور کی سزا پوچھی اور انہوں نے وہ سزا بتائی جو شریعت ابراہیمی کی رو سے چور کو دی جاتی تھی۔ بعد والی آیت بھی صاف بتا رہی کہ خدا کی تدبیر سے مراد یہی ہے۔

تلا یعنی یہ بات حضرت یوسف کی شن پیمبری کے شاہان نہ تھی کہ وہ اپنے ذاتی معاملہ میں شاہ مصبے قانون پر عمل کرتے۔ اپنے بھائی کو داک رکھنے کے لیے انہوں نے خود جو تدبیر کی تھی، اُس میں یہ خلل رہ گیا تھا کہ بھائی (باقی صفحہ ۲۸ پر)

(بقیہ صفحہ ۲۸) آخر وہ کہہ سکتی ہے: کیا دنیا میں کبھی کوئی سلطنت ایسی بھی رہی ہے جس کا قانون چور کو گرفتار کرنے کی اجازت نہ دیتا ہو؟

(۲) اللہ تعالیٰ نے شاہی قانون کے لیے "دین الملک" کا لفظ استعمال کر کے خود اس معنی کی طرف اشارہ فرما دیا ہے جو ملک کا لیاخذ سے لیا جانا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا پیغمبر زمین میں "دین اللہ" جاری کرنے کے لیے مبعوث ہوا تھا نہ کہ "دین الملک" جاری کرنے کے لیے۔ اور اگر حالات کی مجبوری سے اس کی حکومت میں اس وقت تک پوری طرح دین الملک کی جگہ دین اللہ جاری نہ ہو سکا تھا تب بھی کم از کم پیغمبر کا اپنا کام تو یہ تھا کہ اپنے ایک شخصی معاملہ میں دین الملک چل کرے، لہذا حضرت یوسف کا دین الملک کے مطابق اپنے بھائی کو نہ پکڑنا اس بنا پر نہیں ہو سکتا کہ دین الملک میں ایسا کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ پیغمبر ہونے کی حیثیت سے اپنی ذاتی حد تک دین اللہ پیش کرنا ان کا فرض تھا اور دین الملک کی پیروی ان کے لیے قطعاً نامناسب تھی۔

(۳) قانون ملکی (Law of the land) کے لیے لفظ "وین" استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنی دین کی درست پوری طرح واضح کر دی ہے اور ان لوگوں کے تصور دین کی جڑ کاٹ دی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی مسنوں میں عداوت و اہل کی پر جا کرنے اور محض چند مذہبی مراسم و عقائد کی پابندی کرا لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ ان فی تمدن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے دنیوی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان امور کے بارے میں دین کی ہدایات محض اختیاری سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے، ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے، اصول و ضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصور ہیں جس کا ایک مدت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظام زندگی کے قیام کی سعی سے غافل کرنے کا ذمہ دار ہے جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظام زندگی پر نہ صرف راضی ہوئے بلکہ ایک نبی کی سنت سمجھ کر اس نظام کے پرزے بنے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے ہیں، اس آیت کی رو سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہذا ان الدین عند اللہ الاسلام اور من یستغ غیر الاسلام دینا قلن یقبل منه وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے (باقی صفحہ ۳۰ پر)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱) اس سے مراد عزت، غار روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے ہاں ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی۔

۱۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصر کی حکومت میں دین الملک نہ ہی جاری تھا، اور اگر اس حکومت کے حاکم اعلیٰ حضرت یوسف ہی تھے، جیسا کہ تم خود پہلے ثابت کر چکے ہو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ حضرت یوسف، خدا کے پیغمبر، خود اپنے ہاتھوں سے ملک میں "دین الملک" جاری کر رہے تھے۔ اس کے بعد اگر اپنے ذاتی معاملہ میں حضرت یوسف نے دین الملک کے بجائے شریعت ابراہیمی پر عمل کیا بھی تو اس سے فرق کیا واقع ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یوسف مامور تو دین اللہ جاری کرنے ہی پر تھے اور یہی ان کا پیغمبر از مشن اور ان کی حکومت کا مقصد تھا، مگر ایک ملک کا نظام عملاً ایک دن کے اندر نہیں بدل جایا کرتا۔ آج اگر کوئی ملک بالٹیکہ ہمارے اختیار میں ہو اور ہم اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی خالص نیت ہی سے اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں، تب بھی اس کے نظام تمدن، نظام معاشی، نظام سیاست، اور نظام عدالت و قانون کو بالکل بدلتے بدلتے برسوں لگ جائیں گے اور کچھ مدت تک ہم کو اپنے انتظام میں بھی سابق قوانین برقرار رکھنے پڑیں گے۔ کیا تاریخ اس بات پر شاہد نہیں ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی عرب کے نظام زندگی میں پورا اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے نو دس سال لگے تھے اور اس دوران میں خاتم النبیین کی اپنی حکومت میں چند سال شراب نوشی ہوتی رہی، سودیا اور دیا جاتا رہا، جاہلیت کا قانون میراث جاری رہا، پرانے قوانین نکاح و طلاق برقرار رہے، بیوی فاسدہ کی بہت سی صورتیں عمل میں آتی رہیں، اور اسلامی قوانین دیوانی و قوجداری بھی اول روز ہی تمام وکمال نافذ نہیں ہو گئے۔ پس حضرت یوسف کی حکومت میں ابتدائی آٹھ نو سال تک سابق مصری بادشاہت کے کچھ قوانین چلتے رہے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس سے یہ دلیل کیسے نکل آتی ہے کہ خدا کا پیغمبر مصر میں خدا کے دین کو نہیں بلکہ بادشاہ کے دین کو جاری کرنے پر مامور تھا۔ رہی یہ بات کہ جب ملک میں دین الملک جاری تھا ہی تو آخر حضرت یوسف کی اپنی ذات کے لیے اس پر عمل کرنا کیوں شایان شان نہ تھا۔ تو یہ سوال بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر غور کرنے سے باآسانی حل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کے ابتدائی دور میں جب تک قوانین اسلامی جاری نہ ہوئے، لوگ پرانے طریقے کے مطابق شراب پیتے رہے۔

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں، اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔ ان بھائیوں نے کہا یہ چوری کرے تو کچھ تعجب کی بات بھی نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی (یوسف) بھی چوری کر چکا ہے۔ یوسف ان کی یہ بات سن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھوئی، بس (ذریعہ) اتنا کہ کر رکھ گیا کہ بڑے ہی بڑے ہو تم لوگ (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے۔

انھوں نے کہا اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، اس کی جگہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰) مگر کیا حضور نے بھی پی؟ لوگ سوچتے تھے، مگر کیا آپ نے بھی سووی بین دین کیا؟ لوگ متو کرتے رہے اور جن بین الاختین کرتے رہے، مگر کیا حضور نے بھی ایسا کیا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی اسلام کا عملی مجبور یوں کی بنا پر احکام اسلامی کے اجراء میں تدریج سے کام لینا اور چیز ہے اور اس کا خود اس تدریج کے دور میں جاہلیت کے طریقوں پر عمل کرنا اور چیز۔ تدریج کی سختیں دوسروں کے لیے ہیں، داعی کا اپنا یہ کام نہیں ہے کہ خود ان طریقوں میں سے کسی پر عمل کرے جن کے مٹانے پر وہ مامور ہوا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۸) لے یہ انھوں نے اپنی سخت مٹانے کے لیے کہا۔ پہلے کہ چکے تھے کہ ہم لوگ چور نہیں ہیں، اب جو دیکھا کہ مال ہمارے بھائی کی خرابی سے برآمد ہو گیا ہے، تو فوراً ایک جھوٹی بات بنا کر اپنے آپ کو اس بھائی سے الگ کر لیا اور اس کے ساتھ اس کے پہلے بھائی کو لپیٹ لیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت یوسف کے پیچھے بن عیین کے ساتھ ان بھائیوں کا کیا سلوک رہا ہو گا اور کس بنا پر اس کی اور حضرت یوسف کی یہ خواہش ہو گئی کہ وہ ان کے ساتھ نہ جائے۔ لے یہاں لفظ "عزیز" حضرت یوسف کے لیے جو استعمال ہوا ہے صرف اس کی بنا پر مفسرین نے قیاس کر لیا کہ حضرت یوسف اسی منصب پر مامور ہوئے تھے جس پر اس سے پہلے زلیخا کا شوہر مامور تھا۔ پھر اس پر مزید قیاسات کی گئی کھڑی کرنی گئی کہ سابق عزیز مر گیا تھا، حضرت یوسف اس کی جگہ مقرر کیے گئے، زلیخا اور سر نو معرب کے ذریعے جو ان کی اور شاہ مصر نے اس سے حضرت یوسف کا نکاح کر دیا۔ حدیث ہے کہ شب عروسی میں حضرت یوسف اور زلیخا کے درمیان جو باتیں ہوئیں وہ تک کسی ذریعہ سے ہمارے مفسرین کو پہنچ گئیں۔ حالانکہ یہ سب باتیں ہم سرور ہم ہیں، غلط عزیز کے متعلق ہم پہلے کہ چکے ہیں کہ یہ مصر میں کسی خاص منصب کا ذمہ نہ تھا بلکہ محض صاحب اقتدار کے معنی میں استعمال کیا گیا (ذاتی نسخہ موجود)

ہم میں سے کسی کو رکھ بیجیے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں۔" پر سفت نے کہا "پناہ بخرا! دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے پکڑ سکتے ہیں، جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑیں گے تو ہم ظالم ہوں گے۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱) غالباً مصر میں بڑے لوگوں کے لیے اُس طرح کا کوئی لفظ اصطلاحاً رائج تھا جیسے سندوستان میں لفظ "سرکار" بولا جاتا ہے۔ اسی کا ترجمہ قرآن میں عزیز کیا گیا ہے۔ رہا زینحاً سے حضرت یوسف کا نکاح تو اس وقت کی بنیاد صرف یہ ہے کہ بائبل اور تلمود میں فوطیفرع کی بیٹی اُس ساتھ سے ان کے نکاح کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اور زینحاً کے شوہر کا نام فوطیفرع تھا۔ یہ چیزیں اسرائیلی روایات سے نقل و نقل ہوتی ہوئی غفر بن یحییٰ بن یحییٰ اور حبیبیہ کی زبانی افواہوں کا قاعدہ ہے فوطیفرع با سانی فوطیفرع بن گیا، بیٹی کی جگہ بیوی کر لی گئی اور بیوی لا محالہ زینحاً ہی تھی لہذا اس کے حضرت یوسف کا نکاح کرنے کے لیے فوطیفرع کو مار دیا گیا، اور اس طرح "یوسف زینحاً کی تصدیق مکمل ہو گئی۔"

(حاشیہ صفحہ ۳۱) ۱۵ احتیاط ملاحظہ ہو کہ "چور" نہیں کہتے بلکہ صرف یہ کہتے ہیں کہ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اسی کو اصطلاح شرع میں "تورہ" کہتے ہیں، یعنی حقیقت پر پڑنا، یا "آمر و نہی کو چھپانا"۔ جب کسی مظلوم کو ظالم سے بچا جائے یا کسی بڑے مظلم کو دفع کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ ہو کہ کچھ خلاف واقعہ بات کہی جائے یا کوئی خلاف حقیقت حیلہ کیا جائے، تو ایسی صورت میں ایک پرہیزگار آدمی صریح جھوٹ بولنے سے احتراز کرتے ہوئے ایسی بات کہنے یا ایسی تدبیر کرنے کی کوشش کرے گا جس سے حقیقت چھپا کر بدی کو دفع کر دیا جائے۔ اور یہ شرع و اخلاق میں جائز ہے، بشرطیکہ اس کا کام نکالنے کے لیے ایسا نہ کیا جائے بلکہ کسی برائی کو دور کرنا ہو۔ اب دیکھیے کہ اس سارے معاملہ میں حضرت یوسف نے کس طرح جائز تورہ کی شرائط پوری کی ہیں۔ بھائی کی رضا مندی سے اس کے سامان میں پیالہ رکھ دیا مگر ملازموں سے یہ نہیں کہا کہ ان پر چوری کا الزام لگاؤ۔ پھر جب سرکاری ملازم چوری کے الزام میں ان لوگوں کو کھڑا کرے تو غارتگی کے ساتھ اٹھ کر تلاشی لے لی۔ پھر اب جو ان بھائیوں نے کہا کہ بن یمین کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ بیجیے تو اس کے جواب میں بھی بس انہی کی بات اُن پر الٹ دی کہ تمہارا بیٹا فتویٰ یہ تھا کہ جس کے سامان میں سے تمہارا مال غلط دی کر لیا جائے سو اب تمہارے سامنے بن یمین کے سامان میں سے ہمارا مال نکلا ہے اور اسی کو ہم کھاتے ہیں، دوسرے کو اس کی جگہ کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ اس قسم کے تورہ کی مثالیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں بھی ملتی ہیں۔ اور کسی دلیل سے بھی اس کو خلاف معیوب نہیں کہا جاسکتا۔

جب وہ یوسف سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے ہو کہ تمہارے والد تم سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لے چکے ہیں اور اس سے پہلے یوسف کے معاملہ میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں، یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ فرما دے کہ وہ سب کے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جا کر اپنے والد سے کہو کہ ابا جان! آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے، ہم نے اسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو کچھ ہمیں معلوم ہوا اس وہی ہم بیان کر رہے ہیں، اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے، اس قافلے سے دریافت کر لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں، ہم اپنے بیان میں بالکل سچے ہیں۔"

باپ نے یہ داستان سن کر کہا "در اصل تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔ اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ کو لا ملائے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں۔ پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "کرہائے یوسف!۔۔۔ وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ بیٹوں نے کہا "خدا را! آپ تو بس یوسف ہی کو یاد کیے جاتے ہیں، نوبت یہ آگئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے۔" اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا، اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچو! جا کر یوسف اور اس کے بھائی کی کچھ ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔"

جب یہ لوگ مصر جا کر یوسف کی پٹی میں داخل ہوئے تو انہوں نے عرض کیا کہ "اے سردار! اقتدار!

لے یعنی تمہارے نزدیک یہ بادور کر لینا بہت آسان ہے کہ میرا بیٹا، جس کے حسن سیرت سے میں خراب واقف ہوں، محض ایک پیالے کی چوری کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ پہلے تمہارے لیے ایک بھائی کو جان بوجھ کر گم کر دینا اور اس کے قہقہے پر چھوٹا خون لگا کر لے آنا بہت آسان کام ہو گیا تھا، اب ایک دوسرے بھائی کو واقعی چور مان لینا اور مجھے اگر اس کی خبر دینا بھی دیا ہی آسان ہو گیا۔

ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت محبت میں مبتلا ہیں، اور ہم کچھ حیرتی پونجی لے کر آئے ہیں آپ ہمیں
 پھر پورے غنائت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں، اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔" (یہ سن کر
 یوسف سے نہ رہا گیا) اس نے کہا "تمہیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ
 کیا کیا تھا جبکہ تم نادان تھے؟" وہ چونک کر بولے "ہائیں؛ کیا تم یوسف ہو؟" اس نے کہا "ہاں میں
 یوسف ہوں اور میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر احسان فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر
 سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر دیا نہیں جاتا۔" انھوں نے کہا "جی، اگر تم کو اللہ نے
 ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی تم خطا کرتے تھے" اس نے جواب دیا "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ
 تمہیں معاف کرے، وہ سب بڑھ کر تم فرمانے والا ہے۔ جاؤ، میرا رقبہ تمہیں لے جاؤ اور میرے والد کے
 منہ پر ڈالو، ان کی مبنائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔"

لے یعنی ہماری اس گزارش پر جو کچھ آپ دیں گے وہ گویا آپ کا صدقہ ہوگا۔ اس سنے کی قیمت میں جو پونجی ہم
 پیش کر رہے ہیں وہ تو بے شک اس لائق نہیں ہے کہ ہم کو اس قدر غنہ دیا جائے جو ہماری ضرورت کو کافی ہو۔

گناہِ بیش

جو حضرات جماعت اسلامی کے بیت المال یا مکتبہ جماعت اسلامی
 یا دفتر ترجمان القرآن کو اپنی رقیں بینک کے چیک کی صورت میں بھیجتے ہیں
 ان سے اتنا سہ ہے کہ براہ کرم منی آرڈر یا بیمہ کی صورت میں بھیجا کریں۔
 کیونکہ ہمارے کسی دفتر کا حساب بینک میں نہیں ہے اور چیک بھنانے
 میں ہم کو بہت محنت اٹھانی پڑتی ہے۔

"ناظم بیت المال"